



آدھی صدی کا سفر

عرفان احمد خان۔ جرمنی

گزشتہ سے پیوستہ، قسط سوم

18 دسمبر کی اوّلین شب جب میں نے فرینکفرٹ ایئر پورٹ پر جہاز سے باہر قدم رکھا یوتیخ بستہ ہوا کا پھیڑا مجھ سے ٹکرایا جس کے لئے میں ذہنی طور پر تیار نہیں تھا۔ جہاز کی سیڑھیاں اترتے اور بس میں سوار ہونے تک احساس ہو گیا کہ یہ جہاں اور ہے۔ برادر م فرید عارف صاحب ابن مکرم حسن محمد خان عارف صاحب مجھے ایئر پورٹ پر لینے آئے ہوئے تھے۔ ان کی معیت میں نور مسجد پہنچا۔ پچاس سال پہلے فرینکفرٹ میں پبلک ٹرانسپورٹ کی وہ سہولیات موجود نہ تھیں جن کا آج ہم مشاہدہ کرتے ہیں۔ نور مسجد پہنچے تو مولانا فضل الہی انوری سے ملاقات ہوئی۔ یہ ان کی میری پہلی ملاقات تھی۔ ان کو جرمنی آئے ابھی تین ماہ بھی پورے نہ ہوئے تھے۔ مجھ سے پہلے اس مشن ہاؤس میں فرید عارف صاحب اور مغل پورہ لاہور کے ظہیر احمد چودھری صاحب رہ رہے تھے۔ میں ان کی ہنڈیا میں شراکت دار بنا۔ مشن ہاؤس دو حصوں پر مشتمل تھا۔ فرنٹ پر مسجد اور دو کمرے دفاتر کے لئے۔ ان کے بعد کا حصہ پرائیوٹ شمار ہوتا تھا جس میں تین رہائشی کمرے، کچن اور باتھ روم تھا۔ ہم تینوں کی خواب گاہ مسجد کے تین کونے تھے اور کچن کا چولہا بیس منٹ میں ہیٹنگ کی مشین سے جگہ طلب کر کے بنایا گیا تھا۔ میرے دونوں ساتھی صبح کام پر نکل جاتے اور شام کو واپسی ہوتی۔ میرے بارے میں محترم انوری صاحب نے فیصلہ سنایا کہ شدید سردی کے موسم میں باہر نکلنے سے بیمار ہونے کا خطرہ ہے اس لئے میں موسم بدلنے کا انتظار کروں۔ ان دنوں جرمنی کا ویزہ تو نہیں تھا البتہ باڈر پر انٹری سٹیمپ لگتی تھی جس سے آپ کے تین ماہ تک رہنے کی مدت کا تعین کیا جاتا تھا اور اگر سٹیمپ نہ لگے تو جب کبھی آپ پولیس کنٹرول میں دھر لئے جاتے تو پولیس آپ کا پاسپورٹ سٹیمپ کر دیتی جس سے آپ کے تین ماہ کی مدت اس روز سے شروع ہو جاتی۔ جرمنی آمد پر میرا پاسپورٹ سٹیمپ نہیں ہوا تھا اس لئے انوری صاحب نے فیصلہ کیا کہ مجھے لیگل کرنے کا پروسیجر دیر سے شروع کیا جائے۔ فارغ بیٹھنا بھی دو بھر تھا اس لئے میں نے انوری صاحب سے درخواست کی کہ مشن ہاؤس میں ہی کوئی خدمت بتائیں۔

جرمنی میں پہلی خدمت کی سعادت مکرم انوری صاحب نے فرمایا کہ مشن ہاؤس میں مرکز سے جتنے بھی اخبار رسائل آتے ہیں وہ دفاتر اور بیسمنٹ میں بکھرے ہوئے ہیں ان کو جمع کر کے ہر سال کا بنڈل علیحدہ بناؤں۔ چنانچہ میں اس پہلی خدمت میں مصروف ہو گیا۔ ربوہ سے شائع ہونے والے تمام اخبارات اور رسائل یہاں آتے تھے ان کو تلاش کر کے اکٹھا کرنے اور ہر پرچہ کا پورے سال کا بنڈل بنانے میں ایک ہفتہ سے زائد وقت صرف ہو گیا۔ اس کام سے فارغ ہوا تو انوری صاحب نے پوچھا خط لکھ

لیتے ہو۔ میرے ہاں کہنے پر انوری صاحب نے مجھے اردو کے خطوط املاء کروانے شروع کئے۔ قارئین کے لئے یہ بات شاید دلچسپی کا باعث ہو کہ 1972ء میں یورپ میں فوٹو کاپی کا استعمال اتنا عام نہیں تھا۔ فرینکفرٹ کے وسط میں جو بڑا پوسٹ آفس تھا وہاں پبلک کے استعمال کے لئے فوٹو کاپی مشین موجود تھی اور ایک فوٹو کاپی ایک مارک کے عوض ہوتی تھی جبکہ اندرون ملک خط بھجوانے کی ڈاک ٹکٹ چالیس پینی اور پاکستان خط ایک مارک بیس پینی میں جاتا تھا۔ ایک مارک میں فوٹو کاپی کا فرینکفرٹ مشن متحمل نہیں تھا۔ اس لئے انوری صاحب کاربن پیپر استعمال کیا کرتے۔ یہی حال ہدایت اللہ، مبش صاحب کا تھا کہ ٹائپ کرتے وقت کاربن پیپر کا استعمال ضروری تھا۔ تین نوجوان جو مشن ہاؤس میں قیام پذیر تھے ان کو وعظ و نصیحت کے علاوہ مکرم انوری صاحب ان کی نگرانی بھی کرتے کہ پانی کا بے جا استعمال نہ ہو۔ ہیٹنگ صرف نمازوں کے اوقات میں چلائی جاتی۔ جمعہ کے روز نمازیوں میں عرب اور دوسری قومیتوں کے مہمان بھی شامل ہوتے اس لئے مسجد کی ہیٹنگ بروقت چلا دی جاتی تا سردی میں آنے والے مہمانوں کو شکایت نہ ہو۔ جب تک ہمارے مشن خود کفیل نہ ہوئے ہمارے مبلغین نے ان کڑے وقتوں میں اپنی زندگی بسر کی۔

جرمنی میں پہلا روزگار

مکرم انوری صاحب کے فیصلہ کے مطابق میں ابھی کام کی تلاش میں باہر نہیں نکلا تھا کہ اللہ نے چند روز کام کرنے کی سبیل پیدا کر دی۔ کھاریاں کے ایک احمدی دوست مکرم خالد بشیر صاحب فرینکفرٹ کے قریب Dietzenbach نامی قصبہ میں سویٹر فروخت کرنے والی فرم Simba & Company میں ملازمت کرتے تھے۔ وہاں ایک ساتھ بہت بڑی ڈلیوری آئی۔ ان کو سویٹرز پر قیمت کے ٹیگ لگانے اور ری پیک کرنے کے لئے کچھ افراد کی ضرورت پڑی۔ بشیر صاحب نے انوری صاحب سے اجازت لے کر مجھے بھی چند دن کام کرنے کا موقع فراہم کر دیا۔ اللہ ان کو جزاء دے۔ اس زمانہ میں جرمنی میں قیام کی صورت سٹوڈنٹ ویزا پر ممکن تھی۔ بشیر صاحب کی عمر شاید مناسب حال نہیں تھی اس لیے وہ کچھ عرصہ بعد واپس پاکستان چلے گئے تھے۔ پھر ہجرت کے کسی قافلہ کے نکیر بن کر دوبارہ جرمنی آئے۔ ایک لمبا عرصہ بیت السبوح میں امین (کیشیئر) رہے۔ آجکل صاحب فراش ہیں۔ اللہ ان کو کامل شفا عطا کرے۔ ان کی میرے ساتھ کی جانے والی نیکی ہر وقت میری آنکھوں کے سامنے رہتی ہے۔

پردیس میں پہلی آزمائش

سمبا اینڈ کمپنی میں چند روزہ ملازمت کے بعد میں واپس اپنی پرانی روٹین پر واپس آ گیا۔ مکرم انوری صاحب کا مددگار بن کر بہت کچھ سیکھنے کا موقع مل رہا تھا کہ درمیان میں ایک ناخوشگوار واقعہ پیش آ گیا۔ ہم تین ہم عمر نوجوان جو مشن ہاؤس میں مقیم تھے ان

کی نگہداشت، اور روزمرہ کے معمولات پر انوری صاحب کی نگاہ ہوتی تھی۔ ساؤتھ ایشیاء کے جو چند سونوجوان اس علاقے میں آباد تھے ان کی سوشل اور ثقافتی زندگی بہت محدود تھی۔ لوگ زیادہ تر کام کی تلاش میں رہتے۔ جس کا جو دن روزگار میں گزر جاتا وہ پھولے نہ سماتا۔ سٹوڈنٹ ویزا پر مستقل روزگار کا کوئی امکان نہ تھا۔ اچانک یہ بات سننے میں آئی کہ اتوار کے روز انڈین فلم پاکیزہ کربل سینما میں لگے گی۔ جن حالات میں نوجوان یہاں رہتے تھے یہ ایک بڑی خبر تھی۔ اس کی گونج یقیناً انوری صاحب کے کانوں تک بھی پہنچی ہوگی۔ انہوں نے ہم تینوں کو بلا کر کہا کہ اتوار کے روز تم تینوں مشن ہاؤس میں موجود رہو گے۔ کوئی میری اجازت کے بغیر باہر نہیں جائے گا۔ اتوار آئی تو تینوں میں سے ایک دوست بغیر اجازت لئے باہر چلے گئے۔ دوپہر نمازوں پر انوری صاحب نے دیکھ تو لیا لیکن کہا کچھ نہیں۔ عشاء کے بعد ہم تینوں کو دفتر میں طلب کیا۔ ہم لوگ پیش ہو گئے۔ فرید عارف صاحب بہت رونقی، نڈر، حاضر جواب اور بچپن سے اپنی مرضی کے مطابق زندگی گزارنے والوں میں سے ہیں۔ وہ دوپہر کو نہیں تھے۔ انوری صاحب نے ان کو مخاطب کر کے پوچھا کہ اجازت لئے بغیر کہاں گئے تھے۔ انہوں نے بڑے اطمینان سے جواب دیا ”خالہ مینا کماری سے ملنے گیا تھا“ اس کے یہ کہنے کی دیر تھی کہ انوری صاحب کے تن بدن میں آگ لگ گئی۔ انہوں نے ہم تینوں کو مشن ہاؤس سے نکل جانے کا حکم جاری کر دیا۔ ہم دو جو اتوار کے روز مشن ہاؤس میں موجود رہے، نے بہت معافیاں مانگیں لیکن ہم اس لئے سزاوار ٹھہرے کہ فرید کے نکلتے ہی ہم نے رپورٹ کیوں نہ کی۔ جب کچھ پیش نہ گئی تو فروری کی سردی کی رات مشن ہاؤس سے باہر آ گئے۔ فرید عارف صاحب اپنے انڈین دوست پرکاش کی طرف چلے گئے۔ چودھری ظہیر صاحب اوفن بانخ اپنے کسی جاننے والے کے ہاں چلے گئے۔ میں جس کو آئے ابھی دو ماہ نہیں گزرے تھے اور کسی تیسرے فرد کو جانتا نہ تھا سڑک پر آ گیا۔ مسجد کے قریب 36 بس کا آخری سٹاپ ہے جو برآمدہ نما چھتا ہوا ہے۔ اس کے بیچ پر آ کر بیٹھ گیا۔ سردی سے کپکپاتا دیکھ کر دو چار ڈرائیورز نے کچھ کہا تو زبان سے عدم واقفیت کی بناء پر نہ کچھ سمجھ پایا نہ سمجھا پایا۔ رو رو کر خدا سے مدد کیں التجائیں کیں۔ آدھی رات کو خدا نے میری التجا قبول کی۔ جو آخری بس آئی اس سے ایک احمدی دوست عارف خان صاحب اترے۔ وہ مجھے روتا اور سردی سے کپکپاتا دیکھ کر گھبرا گئے۔ کی ہو گیا؟ کی ہو گیا؟ کہتے ہوئے مجھ سے چمٹ گئے۔ میں نے پوری رام کہانی بیان کی۔ عارف صاحب کا تعلق لاہور سے تھا۔ انوری صاحب کے ہم عمر تھے۔ تین سو کلومیٹر دور Hannover شہر میں رہتے تھے۔ برٹش آرمی میں سویلین پوسٹ پر تھے۔ انوری صاحب کے پاس اکثر آتے رہتے تھے۔ زبان سے عدم واقفیت کی وجہ سے عارف صاحب بنک میں اکاؤنٹ نہیں کھولتے تھے۔ انوری صاحب کے پاس

امانت رکھواتے تھے۔ جن دنوں یہاں آتے انوری صاحب کے کچن۔ دھلائی ستھرائی کے سب کام اپنے ذمہ لے لیتے۔ دونوں میں بے تکلفی تھی۔ عارف صاحب اس رات میرے لئے رحمت کافرشتہ بن کر آئے۔ مجھے وہ اپنے ساتھ مسجد لے آئے اور دروازہ کھولتے ہی زور سے انوری صاحب سے مخاطب ہوئے ”ٹسی مُنڈا مار دین لگے سو“ اس کے بعد دونوں کے درمیان جو گفتگو ہوئی ہوگی اس کا اندازہ آپ خود کر سکتے ہیں۔ عارف صاحب نے اس رات میری خوب خدمت کی۔ بیس سال قبل وہ کینیڈا چلے گئے اور وہاں ہی مدفون ہیں۔ اللہ ان کو کروٹ کروٹ جنت نصیب کرے، آمین۔ وہ جب تک جرمنی میں رہے ان کے ساتھ خاندانی تعلق رہا۔ انوری صاحب کا اپنا خیال تھا کہ ان دونوں میں سے کوئی ایک مجھے ساتھ لے گیا ہوگا۔ وہ رات پردیس میں میری پہلی آزمائش تھی۔ لیکن اس آزمائش کے بعد انوری صاحب مرحوم سے محبت و احترام کا ایسا لازوال رشتہ قائم ہوا کہ آج بھی ان کی یاد کو دل میں بسائے پھرتا ہوں۔

مکرم انوری صاحب کی طرف سے دی جانے والی سزاربہ کے اس ماحول کے مطابق تھی جس میں ہم نے آنکھ کھولی اور پروان چڑھے۔ 1966ء میں جب ہم اپنے مکان دارالرحمت غربی ربوہ میں منتقل ہوئے تو مسجد ناصر میں نمازوں کی ادائیگی شروع کی۔ ہم اب تک مسجد مبارک کے ماحول سے مانوس تھے۔ مسجد ناصر میں پہلی صبح فجر کے درس کے بعد ایک بزرگ نے کھڑے ہو کر اعلان کیا کہ دوست چند منٹ ابھی تشریف رکھیں۔ میں نے ضروری بات کرنی ہے۔ انہوں نے کہا کہ میں مرئی اطفال ہوں اور گزرنے والی رات میرا اپنا بیٹا چنیوٹ فلم دیکھ کر آیا ہے۔ میں احباب کے سامنے اپنے بیٹے کو سزا دے کر مثال قائم کرنا چاہتا ہوں۔ چنانچہ بھری مسجد میں انہوں نے اپنے بیٹے کو اس کے ہاتھوں پر 6 بید مارے۔ بیٹے نے بھی اُف نہ کی۔ سزا قبول کی اور معافی مانگی۔ وہ بزرگ میر ریپئیر شاپ کے نام سے ایک چھوٹی سی ورکشاپ چلاتے تھے۔ ایسے اعلیٰ کردار ربوہ کے ہر گلی محلہ میں بکثرت موجود تھے۔ ہمارے اپنے گھر کے ماحول کو میوزک، فلم سے کوئی سروکار نہ تھا۔ لیکن کبھی ریڈیو کی آواز ذرا اونچی ہوتی تو ہمارے ہمسائے میں رہائش رکھنے والے بزرگ سلسلہ پروفیسر بشارت الرحمان صاحب دروازے پر دستک دے کر توجہ دلا دیا کرتے۔ اس ماحول میں پرورش پانے والے نوجوانوں کی شناخت دوسروں سے یقیناً مختلف تھی۔ الیکٹرونس نے جس تیزی سے ترقی کی ہے اس نے دنیا کا ماحول بدل کر رکھ دیا ہے۔ احمدی نوجوان کی ماضی کی پہچان کو برقرار رکھنے کے لئے نظام سلسلہ کبھی بھی غافل نہیں رہا۔ قادیان کے جلسہ سالانہ 2022ء پر حضور انور ایدہ اللہ تعالیٰ کا اختتامی خطاب ہم سب کو اپنی ذمہ داریوں کی طرف متوجہ کر رہا ہے۔ خدا کرے کہ ہماری آنے والی نسلیں اس ماحول سے غفلت

برتنے والی نہ ہوں جو ایک احمدی کی میراث
اور پہچان چلا آ رہا ہے۔
مئی 1974ء کے پُر آشوب حالات میں
جرمنی میں رہنے والے احمدیوں کے احساسات
کیا تھے۔ قومی اسمبلی کی فیصلہ کے نتیجہ میں
جرمنی میں احمدی مہاجرین کی آمد اور مکرم
انوری صاحب کا باپ والا حسن سلوک اگلی
قسط میں ملاحظہ فرمائیں۔